مختصر افسانہ

مختصر افسانہ جدید دور کی اہم نثری صنف ہے۔اس کے ذریعے کسی شخص کی زندگی کے ایک پہلو یا کسی واقعہ کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اُس کا گہرا اثر پڑے۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ایک ممتاز مغربی ادیب کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایسی فنّی تخلیق ہے جس میں فن کار کے ارادے اور حکمت کا بھی دخل ہوتا ہے۔کسی مخصوص واقعے یا صورتِ حال یا کسی مخصوص کردار کا نقش اِس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ یعنی واقعات کی ترتیب و تنظیم پڑھنے والے کو متاثر کر سکے۔

افسانے کے ماہروں نے اس کی جو تعریفیں بیان کی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ بیانیہ تخلیقی تحریر ہے۔افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیشکش بہت نپی تلی ہوتی ہے۔

ہر افسانے کے لیے پلاٹ، کردار اور زمان و مکاں لازمی اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔اسی لحاظ سے افسانے کی اقسام بھی بیان کی گئی ہیں یعنی پلاٹ کا افسانہ، کردار کا افسانہ یا معاشرتی افسانہ۔

افسانے کی کامیابی کے لیے کچھ ناقدین، افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کو اہم قرار دیتے ہیں۔افسانہ نگار کے اسلوب میں رمز، کنایے اور تاثیر کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہوا۔سب سے پہلے پریم چند اور سجّاد حیدر یلدرم کے افسانے سامنے آئے۔ان کے فوراً بعد کئی افسانہ نگار ابھرے: مثال کے طور پر ل۔احمد اکبرآبادی، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔اس سے چند برس پہلے ''انگارے'' کے نام سے باغیانہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ان کہانیوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی۔اس کے بہت پہلے پریم چند

(1880 تا 1936) نے اردو، افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پریم چند نے حقیقت نگاری اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ مشرقی یوپی کی دیہی زندگی اور قومی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی۔اس کے بعد سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عبّاس، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کے ہاتھوں اردو افسانے نے بہت ترقی کی۔

آزادی کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔1960 کے لگ بھگ اردو میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا۔اس رنگ کے نمائندہ افسانہ نگار انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجّاد، بلراج مین را، نیّر مسعود اور خالدہ حسین ہیں۔حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عبّاس، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، رام لعل، جوگندر پال قابل ذکر ہیں۔نئی نسل کے کئی افسانہ نگاروں نے براہ راست طرز بیان کے بجائے علامتی طرزِ بیان کو ترجیح دی ہے۔

بلونت سنگھ

1920/21 تا 1986

بلونت سنگھ ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی۔ میٹرک دہرہ دون کے کیمبرج اسکول سے پاس کیا۔ کرسچین کالج الہ آباد سے انٹر اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد معاش کی تلاش میں لاہور اور کراچی بھی گئے۔ دہلی میں رسالہ'' آج کل'' کے نائب مدیر کی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے بعد سے اپنے انتقال تک الہ آباد میں رہے۔ انھوں نے الہ آباد سے اردو میں رسالہ'' فسانہ'' اور ہندی میں'' اردو ساہتیہ'' جاری کیا جس میں اردو تخلیقات، ناگری رسم الخط میں شائع ہوتی تھیں۔

بلونت سنگھ نے کئی طویل اور مختصر ناول لکھے۔'' رات چور اور چاند'' اور'' چک پیراں کا جسّا'' پہلے اردو میں شائع ہوئے۔ ان کے ناگری رسم الخط میں شائع ہونے والے ناولوں اور افسانوی مجموعوں کی تعداد لگ بھگ تیس ہے۔

ان کا پہلا افسانہ'' سزا'' 1937 میں دہلی کے رسالے'' ساقی'' میں شائع ہوا۔'' جگّا''،'' تار و پود''،'' ہندوستان ہمارا''، '' پہلا پتھر''،'' بلونت سنگھ کے افسانے'' اور'' سنہرا دیس'' ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

بلونت سنگھ کے ابتدائی افسانوں میں پنجاب کی دیہی زندگی کا بہت جیتا جاگتا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اسی بنا پر کچھ لوگوں نے فرض کرلیا کہ بلونت سنگھ صرف پنجاب کے دیہات اور سکھ کرداروں کی زندگی کے عکاس ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا افسانوی کینوس خاصا وسیع ہے۔

لمحے

سوم کا دن تھا۔

یوں تو میں اپنے دوستوں کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ دوستوں کی صورت تک نہ دکھائی دے اور میں محض اپنے لیے ہی ہو کر رہ جاؤں۔ میرے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے اس لیے مجھے ایسے دن بھی میسر آ جاتے ہیں۔

جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ اسی قسم کا دن تھا، صبح کا وقت تھا، پیشتر اس کے کہ کوئی دوست میرے مکان پر پہنچ کر ''اُما کانت! اُما کانت!!'' کے نعرے لگاتا میں چائے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

نہ بیوی، نہ بچے، نہ ملازمت، نہ کاروبار، نہ خوشی نہ غمی، عجب ویران کیفیت میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میری بیکاری سے گھر والوں کی ناخوشی کے باعث، دل پر اداسی چھائی رہتی تھی۔ کوئی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ ہلکا رہتا تھا۔ اپنی بیوی نہ ہونے کے سبب سے، ذہن پر رومانیت کا تسلّط تھا۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ کر دیکھا کہ کناٹ پلیس جانے کے لیے بس تیار کھڑی ہے۔ اندر اِکّا دُکّا مسافر بیٹھے ہیں، کوٹ کے کالر درست کرتا ہوا بس کے اندر داخل ہو گیا۔

آٹھ بجے تھے۔ بھلا سردی کے موسم میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ گھر کی گرم فضا سے نکل کر باہر کو اٹھ بھاگے۔ چنانچہ بس میں ایک عجیب سکون طاری تھا۔ چند لوگ ایک دوسرے سے پرے پرے بیٹھے دھیرے دھیرے باتیں کرنے میں محو تھے۔

میں نے پہلے عورتوں اور لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ تین لڑکیاں تھیں اور دو عورتیں۔ لڑکیاں گوری تھیں، دو دو چوٹیاں، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، باتیں میٹھی نہ پھیکی۔ دوسری عورت کی جانب دیکھا۔ ہرے رام! وہ تو صورت سے بالکل آیا لگی۔ شاید سچ مچ کی آیا ہو۔ خیر اب ایک عورت کا جائزہ لینا باقی تھا۔ وہ میری جانب پیٹھ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے پر ننھے بچے کا سر ٹِکا تھا اور ایک بچّی سامنے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گویا وہ کم از کم دو بچّوں کی ماں تھی۔

دل پر مایوسی کا جذبہ طاری ہونے لگا۔ بیس پچیس منٹ کا یہ سفر یونہی کٹ جائے گا۔ دل بہلاوے کی کوئی حسین صورت

دکھائی نہ دے گی۔کیا یہ سفر جماہیاں لیتے ہی بِتانا پڑے گا۔

سوچا—اگر دو بچّوں کی ماں بدصورت ہے تو اپنی بہنوں سے بڑھ کر کیا ہوگی۔یہی نا کہ ان کے برابر ہوگی یا ذرا بہتر۔آخر یہی طے پایا کہ اُس خاتون کے عین پیچھے والی سیٹ پر ڈیرا جمایا جائے۔

پچھلی سیٹ پر چپکے سے بیٹھ کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں کی تہہ جمائی اور پھر انتظار کرنے لگا کہ وہ ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھے تو صورت کا جائزہ لیا جائے۔

لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سامنے کی جانب منہ کیے چپکی بیٹھی رہی۔یہاں تک کہ بس چل دی۔

مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔بارے کنڈکٹر نے آکر دام طلب کیے۔ٹکٹ لیتے وقت خیال آیا کہ کاش اُس خاتون سے تھوڑی بہت بات چیت ہوچکی ہوتی تو اُس کے ٹکٹوں کے دام دے کر اچھے خاصے مراسم پیدا کیے جاسکتے تھے۔جب اس کی باری آئی

تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ رخِ روشن کا جلوہ دکھائی دیا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ واقعی بہت حسین تھی۔ تارا سی آنکھیں، نازک لب، اور درخشاں پیشانی— خلافِ امید اُس عورت کو حسین پا کر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اس سے گفتگو کیوں کر شروع کی جائے۔ کون سا موضوع مناسب رہے گا۔ موسم؟.....لیکن ہندوستان میں ابھی موسم کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس عورت سے یہ کہنا کہ آہا! کیا ہی خوشگوار موسم ہے محض بیکار ہوگا۔ سینما، ایکٹر، ایکٹریس، بسیں، سڑکیں.....نہیں، نہیں، یہ باتیں مہمل ہیں.....اتنے میں عورت کے شانے کے ساتھ لگے ہوئے ننھے بچّے نے آنکھیں کھولیں اور حیرت واستعجاب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی تو اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دونوں انگلیوں سے اس کی ٹُھڈّی کو ہلکے ہلکے سہلانا شروع کیا تو وہ ہنسنے لگا— میں جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس بات کا علم ہو چکا ہے۔

بچے کے کانوں کے پیچھے داد کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جرأت سے کام لے کر پوچھا۔

''کیوں جی! ننھے کے کانوں کے پیچھے داد ہو رہا ہے.....''

''جی—ہاں.....''

''تو کیا آپ اس کا علاج نہیں کرائیں گی؟

''علاج تو ہو رہا ہے.....''

''کیا ہومیوپیتھی علاج کرا رہی ہیں؟''

''جی نہیں، ہے تو ایلوپیتھی.....''

''ایک ڈاکٹر ہیں، رُچی رام۔ ہومیوپیتھی علاج کرتے ہیں۔ خصوصاً بچوں کے علاج میں تو اُنھیں مہارت حاصل ہے۔ اگر یہ علاج موثر ثابت نہ ہوا، تو اُن سے رجوع کیجیے گا۔''

''بہتر۔''

''بہت ہی پیارا بچّہ ہے۔'' میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

عورت نے بچّے کو شانے سے ہٹا کر کھڑکی کے ساتھ پیٹھ لگا لی۔ اب اُس کا رُخ قریب قریب میری جانب تھا۔ اس نے بچّے کو زانو پر بٹھا کر دیکھنا شروع کیا وہ واقعی حسین ہے یا نہیں۔ پھر جیسے دل ہی دل میں اُس نے میرے قول کی تائید کرتے ہوئے میٹھی

نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''آپ کو بچّوں سے خاصا لگاؤ ہے۔کیا آپ کے بھی بچّے ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔''ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔''

''کیوں شادی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟''

''یونہی۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔''یہی، ابھی بے کار ہوں۔جب تک آمدنی کی معقول صورت نہ ہو، دل میں شادی کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔''

''لیکن آپ بیکار کیوں ہیں؟''

میں اس جرح سے گھبرا گیا تھا۔''میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔آمدنی کی صورت نظر آنے لگی تو فساد شروع ہو گئے اور مجھے اِدھر بھاگنا پڑا.....اب نئے سرے سے کام کرنے کا خیال ہے۔''

عورت کی آنکھوں میں اُداسی کی جھلک دکھائی دی۔اُس وقت وہ کچھ کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کے حسین چہرے کے خدوخال کا بغور جائزہ لینے لگا.....کیا وہ میری خاطر اُداس تھی؟ ایک لمحے کے لیے ہی سہی!—— کاش! مجھے بھی ایسی ہی موہنی بیوی مل جائے۔

کہتے ہیں کہ عورت مرد کے دلی جذبات کو بہت جلد پہچان لیتی ہے۔عورت نے نظریں جھکا لیں اور پھر قدرے تامّل کے بعد نہ معلوم کیوں—— بڑی بچّی کی جانب اشارہ کر کے مسکرا کر بولی۔''یہ میری بیٹی ہے۔''

''آؤ بیٹی! میرے قریب آؤ.....'' میں نے ہاتھ پھیلائے۔وہ مارے شرم کے آگے نہیں بڑھی تو میں نے خود ہی بڑھ کر اسے گود میں بٹھا لیا۔''آہاہاہا.....بڑی اچھی ہے ہماری بے بی.....اچھا تو تم پڑھتی ہو کیا؟''

لیکن وہ بڑے اہتمام کے ساتھ شرماتی رہی۔

عورت بولی''بتاؤ نا بے بی! تم سے کئے مرتبہ کہا ہے کہ یونہی مت شرمایا کرو۔''

میں نے سوچا۔کس قدر مہذب ہے یہ عورت۔اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور خاصی سلجھی ہوئی ہے۔

ماں کے سرزنش کرنے پر بیٹی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا پڑھا ہے بھئی ہمیں بھی سناؤ.....تم تو بہت اچھی بے بی ہو۔تمھیں تو پڑھا لکھا یاد ہوگا سارا، بولو یاد ہے؟''

''ہاں جی۔'' بے بی نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر بھرپور نظروں سے میری جانب دیکھا۔معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا اقبال

کرنے میں اسے بہت فخر محسوس ہو رہا ہے۔ کیا پڑھا ہے تم نے؟

''اے بی، سی، وائی، زیڈ۔''

اس پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔ میں اور وہ عورت۔ ہم دونوں جو ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ لیکن قہقہوں کی ملی جلی آواز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئین کوئی سحر انگیز ڈویٹ گا رہے ہوں۔

عورت نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ ''اری بے بی! تجھے اے، بی، سی، ابھی تک یاد نہیں ہوئی۔ سی کے بعد ایک دم وائی زیڈ؟''

اب ہماری ملاقات قابلِ اطمینان درجے تک آن پہنچی تھی۔ اب بیشتر خدشات دور ہو چکے تھے۔ ہم دو بہت اچھے واقف کاروں بلکہ دوستوں کی طرح گفتگو کرنے لگے۔

بیس یا پچیس منٹ کے سفر میں زیادہ باتیں نہیں ہو سکتی تھیں، لیکن اگر احساسات کو لیجیے تو لمحہ بھر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک میٹھی نظر تھی کہ زندگی کے ان لمحوں کو رنگین بناتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ اور رسیلا پن تھا کہ مدّتوں کانوں میں شہد سا گھلتا رہا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم اس قدر محو تھے کہ اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہی تھی ——— جب میں نے جنگل میں شیر کے فرضی شکار کی کہانی سنائی اور میں نے شیر کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر گولی چلائی تھی تو عورت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت سے بولی۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ شیر کا شکار مچان پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا ''لیکن کہنہ مشق شکاری مچان پر کبھی نہیں بیٹھتے ہیں۔'' وہ سچ مچ میری بات پر ایمان لے آئی۔ باتوں باتوں میں مجھے خیال آیا کہ مرد کے دل میں عورت کی کشش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کے سامنے وہ دل کھول کر جھوٹ بول سکتا ہے۔

عورت طفلانہ انداز سے کئی باتیں پوچھتی رہی اور میں بڑی توجہ سے ان کے جواب دیتا رہا۔ بس کی منزل قریب آ رہی تھی۔

بے بی ابھی تک میری گود میں بیٹھی تھی۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کام نکل جانے کے بعد بے بی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے محجوب ہو کر بے بی کی بغلوں کو گدگدایا ''ارے بے بی! تم تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں ——— کیا تم ہم سے خفا ہو؟''

وہ چپ رہی۔

''بولو ——— بے بی۔''

''لا ہیں۔'' بے بی نے انکار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا لام؟''

''ہاں۔''

''سول تاناں۔''

''سلطانہ۔'' عورت نے کہا۔

مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا علم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ سلطانہ کی بغلوں کو گدگداتے ہوئے میرے ہاتھ رُک گئے۔ میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

''جی۔'' یہ کہہ کر عورت نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' میں ہنس دیا—— ''مجھے محسوس نہیں ہوا کیونکہ بظاہر.....''

پھر قدرے بھدّی سی خاموشی طاری ہوگئی۔

بات کچھ بھی نہیں تھی—— میں نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

''فساد کے دنوں میں آپ دہلی ہی میں تھیں؟''

''جی ہاں ہم سب یہیں تھے۔''

میرے دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگا۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا۔ ''آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

عورت نے قدرے سکوت کیا۔ ''بس کچھ نہ پوچھیے۔ مالی نقصان بہت ہوا، جانیں بچ گئیں۔ یہی غنیمت سمجھیے۔ کناٹ پلیس میں ہماری دکان لُٹ گئی۔ مکان میں فسادی گھس آئے ..... لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی نقصان ہوتا پولس آ گئی .....''

میرا سر جھک گیا..... ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اسٹینڈ پر پہنچ کر بس رُک گئی۔

اس خیال سے کہ عورت تنہا ہے اور بچے دو، شاید اُسے میری مدد کی ضرورت ہو، میں نے اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تامل کیا لیکن عورت کے ہلکے پن سے روشن ہوا کہ (اُسے) میری مدد درکار نہیں ہے۔ چنانچہ میں شریف مرد کی طرح اٹھ کر چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے یونہی گھوم کر دیکھا کہ وہ عورت اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے، لیکن اس کے قدم اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ قدرے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس کی ٹانگ میں یہ نقص نہ ہوتا تو وہ قدم قدم پر فتنے جگاتی۔ ایسی حسین عورت اور یہ عیب!

دفعتاً ہماری نظریں ملیں —— غالباً وہ سمجھے بیٹھی تھی میں چلا گیا ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے پا کر وہ پریشان سی ہوگئی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''آخر تم نے مجھے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھ لیا نا۔''

محجوب ہو کر اس نے اپنا گلابی ہوتا ہوا چہرہ جیسے جھکا لیا اور پھر جیسے روٹھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں اُسے منانے کے لیے آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''معزز خاتون! تم بہت حسین ہو۔ تم حسن کی پتلی ہو، تم کیا جانو میں ان چند دلفریب لمحوں کے لیے تمھارا کس قدر شکرگزار ہوں۔''..... اور پھر میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''معاف کیجیے گا —— آپ کچھ پریشان سی نظر آتی ہیں۔ کیا آپ کو کہیں آگے جانا ہے۔ تانگہ لاؤں؟..... یا آپ کو کسی کا انتظار ہے؟''

اس نے سر پر دوپٹہ سنوارتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی جانا تو قریب ہی ہے..... وہ نہیں آئے..... ملازم کو بھیج دیتے، ملازم کو تو آنا ہی چاہیے تھا.....''

میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ ''چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔'' وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ہو لی۔

ابھی ہم پندرہ بیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ بول اٹھی۔ ''لیجیے وہ لڑکا..... ہمارا نوکر چلا آ رہا ہے۔''

ہم رک گئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا پیدائشی نقص ہے؟''

اس نے قدرے تامّل کیا۔ پھر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''جی نہیں —— جب فسادیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کیا تو ایک سوربیر نے لاٹھی گھما کر ماری تھی.....''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے بچی کو نوکر کی طرف بڑھایا..... میری پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب میں رومال ٹٹولنے لگا۔

رخصت کے موقعے پر کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ چنانچہ میں کچھ اس انداز سے دو قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ قدیم بابلیوں کی حسین شہزادی ہو۔ میری آنکھیں جھک کر اُس کے قدموں پر جم گئیں۔ میں نے تصوّر ہی تصوّر میں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر اچٹتی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ان آنکھوں میں وہ روکھا پن نہ تھا، نہ سختی اور پھر مجھے

یوں محسوس ہوا کہ وہ مہربان ہوتی ہوئی کسی خودسر ملکہ کی طرح کہہ رہی ہے'' مابدولت خوش ہوئے..... مابدولت نے نہ صرف تمھیں بلکہ تمھاری ساری قوم کو معاف کیا۔''

ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک دوسرے کی جانب شکرگزار نظروں سے دیکھا—اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک دوسرے کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوگئے۔

(بلونت سنگھ)

مشق

لفظ و معنی

سوم کا دن	:	سوم وار، پیر
مراسم	:	(رسم کی جمع) میل جول، تعلّقات
درخشاں	:	چمک دار
ہاتھ پاؤں پھولنا	:	(محاورہ) گھبرا جانا
خاطرخواہ	:	مرضی کے مطابق
مہمل	:	بے معنی
شانہ	:	کندھا
مؤثر	:	کارگر، اثر دار
رجوع کرنا	:	کسی سے مشورہ طلب کرنا
زانو	:	جانگھ، ران
قول	:	کہی ہوئی بات

تائید	:	مدد کرنا، اتفاق کرنا، ساتھ دینا
خدوخال	:	ناک نقشہ
مہذّب	:	تہذیب یافتہ
موہنی	:	پُرکشش
تامّل	:	جھجک، دیر
سرزنش	:	ڈانٹ پھٹکار
اثبات میں سر ہلانا	:	کسی بات کو تسلیم کرنا
اقبال کرنا	:	مان لینا
ڈویٹ (DUET)	:	دوگانا، مردانہ اور نسوانی آوازوں میں ملا کر گایا ہوا گیت
خدشات	:	(خدشہ کی جمع) اندیشہ، خطرہ
کہنہ مشق	:	ماہر، تجربے کار
طفلانہ انداز	:	بچّوں جیسا ڈھنگ
محجوب ہونا	:	شرمندہ ہونا
سکوت	:	خاموشی
فتنے جگانا	:	ہنگامہ برپا کرنا، مصیبت کھڑی کرنا
دفعتاً	:	اچانک
مابدولت	:	ہم (بادشاہ اور شہزادے، شہزادیاں اپنے آپ کو ''ہم'' کے بجائے مابدولت کہتے تھے)

غور کرنے کی بات

- بلونت سنگھ نے یہ افسانہ، اس کے ایک کردار اُما کانت کی زبانی بیان کیا ہے۔ افسانہ ''لمحے'' کسی بہت نمایاں واقعے کے بجائے ایک دُکھ بھرے احساس پر مبنی ہے۔
- عورت کی گہری اداسی اور اُما کانت کی شدید شرمندگی کے ذریعے، بلونت سنگھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے دُکھوں میں شرکت ہی حقیقی انسانیت ہے۔

سوالات

1. اس افسانے کا عنوان لمحے کیوں رکھا گیا ہے؟
2. بس کے مسافروں کے بارے میں افسانہ نگار نے جو تفصیل پیش کی ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
3. اس افسانے کا مرکزی خیال کیا ہے؟

عملی کام

- اس افسانے میں جس واقعے کا بیان کیا گیا ہے اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔